ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم

باہمت قوموں کا شیوہ

اسلامیہ کالج لاہور میں خطبۂ جلسۂ عطائے اسناد

میرے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ میں اسلامیہ کالج کے پرنسپل اور اساتذہ کا شکریہ ادا کروں یا اس کا شکوہ کروں کہ مجھے بحیثیت واعظ یہاں لاکر کھڑا کر دیا۔ میں ناصح اور واعظ نہیں اور نہ پیشہ ور مصلح قوم ہوں۔ ناصحوں اور واعظوں پر شاعروں اور عاشقوں نے جو تبرا کیا ہے مجھے اس سے بہت حد تک اتفاق ہے۔

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح
کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

اور ہماری پریشان حال قوم کے اکثر مصلحین، جامۂ سیاست میں ملبوس ہوں یا عمامۂ امامتِ دیں بسر ہماری بدقسمتی سے زیادہ تر ایسے ہی ہیں جن کی نسبت قرآنِ کریم میں شروع میں بغرضِ تنبیہ ارشاد ہوا ہے کہ:

واذا قیل لھم لا تفسدوا فی الارض قالوا انما نحن مصلحون۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ دیکھو اس دنیا میں فساد مت پھیلاؤ تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو مصلح ہیں۔

جلسۂ تقسیم اسناد میں کسی کا خطبہ پڑھنا ایک رسم ہے جو کسی نہ کسی کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ مجھے یقین نہیں کہ اس قسم کے رسمی وعظ سے کسی پر کچھ اثر بھی ہوتا ہے۔ اگر ہماری قوم میں گیلپ پول کا رواج ہو تو یہ امر قابلِ تحقیق ہے کہ یونیورسٹیوں سے ڈگریاں حاصل کرنے والے بے شمار منتہیانِ علوم و فنون میں سے کوئی شخص بھی ایسا نکلتا ہے یا نہیں جو وثوق کے ساتھ کہہ سکے کہ جلسۂ تقسیم اسناد میں میں نے فلاں فلاں ماہرِ تعلیم یا حضرت ناصح سے جو خطبہ سنا تھا اس میں سے فلاں فلاں بات میری لوحِ قلب پر کندہ ہو گئی، جس نے میری زندگی میں نمایاں اور مستحسن تغیر پیدا کیا۔ میں اس بارے میں کسی مغالطے میں مبتلا نہیں۔ آپ کو تعجب ہو گا اگر میں آپ سے یہ کہوں کہ میں نے عمر بھر نہ کبھی وعظ کیا اور نہ لیکچر دیا۔ آپ کہیں گے کہ تیس برس یونیورسٹی میں آپ لیکچر نہیں دیتے رہے تو اور کیا بھاڑ جھونکتے رہے ہیں۔ میں اپنے ایک عزیز ترین اور قابل ترین شاگرد کو جو آپ کے اسٹاف کے ایک سربرآوردہ رکن ہیں بطور شاہد عادل اس شہادت کے لئے پیش کرتا ہوں کہ میں فلسفے جیسے خشک مضمون کی پیوست کو تری و تازگی میں بدلنے کے لئے طالب علموں سے تبادلۂ خیال اور باندازِ سقراط باتیں ہی کرتا تھا، لیکچر نہیں دیتا تھا۔ میری بیٹی نے جو پاکستان کی

اپریل ۱۹۵۸ء

ایک یونیورسٹی میں ایم۔ اے کو سائیکولوجی پڑھاتی ہیں، کوئی آٹھ برس کی عمر میں مجھ سے پوچھا کہ ابّا جان آپ روز کہاں جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں یونیورسٹی میں جاتا ہوں اور پڑھنے والے بچوں کو لیکچر دیتا ہوں۔ اس نے پوچھا کہ لیکچر کیا ہوتا ہے۔ میں نے کہا کہ میں بولتا جاتا ہوں اور وہ سنتے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ وہ کچھ نہیں بولتے؟ میں نے کہا کہ وہ سنتے رہتے ہیں۔ میں نے اس کو لیکچر کا عام مفہوم سمجھانے کے لئے یہ کہہ دیا حالانکہ یہ واقعہ نہیں تھا۔ اس پر وہ بولی کہ اچھا میں سمجھ گئی لیکچر کے یہ معنی ہیں کہ اپنی سناتے جانا اور دوسروں کی نہیں سُننا۔ میرا خیال ہے کہ لیکچر کی تعریف اس سے بہتر نہیں ہو سکتی۔ میں بھی کبھی کبھی اس گناہ کے ارتکاب پر مجبور ہوا ہوں لیکن اپنے میلان طبع کے خلاف۔ اب جو باتیں میں آپ سے کرنا چاہتا ہوں اس کو آپ نہ وعظ سمجھیں اور نہ لیکچر۔ خواہ آپ کو ان دونوں کی کچھ جھلکیاں اُن میں نظر آئیں۔ وعظ اور لیکچر کے فرق و امتیاز کے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ بھی سُن لیجئے۔ کوئی نصف صدی پیشتر جب میں سرسید احمد علیہ الرحمۃ کے علیگڑھ کالج میں طالب علم تھا، اس زمانے میں جمعہ کا خطبہ اور وعظ ایک ایسے عالمِ دین فرماتے تھے جن کی تقریر ایک آبشار یا سیلِ کہسار تھی۔ اس میں بلاغی روانی ہوتی تھی۔ قصّے، اشعار، آیات، مثالیں، رنگا رنگ کے مضامین، گوناگوں بوقلموں مسائل عنان گیختہ بہتے چلے جاتے تھے۔ ایک روز ایک طالب علم کی جو شامت آئی تو اس نے کہا مولانا آپ کا وعظ تو خوب ہوتا ہے۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ اس کا موضوع کیا ہے۔ مولانا نے بگڑ کر جواب دیا کہ نالائق وعظ میں موضوع ڈھونڈتا ہے۔ میاں یہ وعظ ہے کوئی لیکچر نہیں۔ وعظ کا کسی موضوع سے کیا واسطہ؟

اس تفریحی گفتگو کے بعد آئیے کچھ کام کی باتیں کریں۔

امر واقعہ ہے کہ آج کل پاکستان میں اکثر افراد پریشان حال و پریشان خاطر دکھائی دیتے ہیں۔ اضطراب فطرت انسانی کا ایک لاینفک جوہر ہے۔ انسانی تاریخ میں شاید ہی کوئی زمانہ ایسا گزرا ہو جس میں زیادہ تر انسان ششدر و حیران و متفکر نہ تھے۔ بے اطمینانی انسانی نفس اور انسانی معاشرت کی ساخت کے اندر موجود ہے۔ ایک گرہ کھلنے نہیں پاتی کہ کوئی دوسری گرہ پڑ جاتی ہے۔ یا زخم کے بھرنے تلک ناخن بھی بڑھ آتے ہیں۔ زیادہ تر انسان اس مغالطے میں رہتے ہیں کہ پہلے زمانے اچھے تھے اور ہر قسم کی خرابیاں عصرِ حاضر ہی میں پیدا ہوئی ہیں۔ لیکن جن زمانوں کو انسان کا رومانی تصوّر جنّتِ گم گشتہ سمجھتا ہے۔ اس زمانے کے ادیب اور مفکّرین و مصلحین خود اس دَور کو بدترین خیال کرتے تھے۔ حافظ شیرازی نالہ و فغاں کرتے ہیں:

این چہ شوریست کہ در دورِ قمر مے بینم
ہمہ آفاق پُر از فتنہ و شر مے بینم
دختراں را ہمہ جنگ است و جدل با مادر
پسراں را ہمہ بدخواہِ پدر مے بینم

امام غزالی علیہ الرحمۃ اس دور کے اکابرین سے ہیں جسے اب ہمارے مؤرخ شوکت اسلامی کا دور سمجھتے ہیں۔ لیکن وہ اس وقت کے حکمرانوں اور ارباب حل وعقد کو دین واخلاق سے معرا سمجھتے تھے اور اس وقت کے علما وفقہا کی سیرت کا جو تجزیہ انہوں نے کیا ہے ہمارے دور میں بھی جامد و تنگ نظر ملائیت کا مخالف اس پر کوئی اضافہ نہیں کرسکتا۔ عارف رومی کہتا ہے کہ انسان کی عام فطرت ہی ایسی ہے کہ اس کو امن نصیب نہیں ہوتا۔ ایک مقام اور ایک حالت سے عبور کرکے بغرضِ حصول راحت دوسرے مقام اور دوسری حالت پر سنہری اُمیدوں اور سہانے سپنوں کے ساتھ پہنچتا ہے تو وہاں کسی غیر متوقع آفت سے دوچار ہوتا ہے:

گر گریزی با اُمید راحتے
ہم در آنجا پیشت آید آفتے
ہیچ گنجے بے ددو بے دام نیست
جز بخلوت گاہِ حق آرام نیست

بھگت کبیر دورِ قدیم کا موحد صوفی انسانوں کی عام حالت کو اس دھرے میں بیان کرتا ہے:

اونچا چڑھ کر دیکھ تماشا گھر گھر ایک ہی لیکھا
سوچ بچار میں سبھی پڑت ہیں ہنستا کوئی نہ دیکھا

انسان کی زندگی ہی یہی ہے کہ ہر قدم پر اس کو مشکلات وموانع کا سامنا کرنا پڑتا ہے موانع پر غالب آنے سے انسان کے نفس میں قوت اور وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ شر کے وجود کی وجہ سے زمانے کو یا خدا کو متہم کرنا بے بصری کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ اگر شر نہ ہو تو خیر کا وجود بھی مفقود ہو جائے۔ اسی لئے ایک حدیث قدسی میں خدا نے فرمایا کہ زمانے کو گالیاں مت دو کیونکہ زمانہ میں ہی ہوں:

لا تسبوا الدھر فانی انا الدھر

آج کل آپ کو اکثر لوگ یہی کہتے سنائی دیں گے کہ کیا کریں زمانہ بہت خراب آگیا ہے۔ لوگوں میں انصاف ورحم نہیں رہا۔ لیکن ہر کہنے والا اپنے آپ کو مستثنیٰ سمجھ کر بات کرتا ہے۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر سب کہنے والے خود اچھے عادل وعاقل ورحیم وکریم ہیں تو وہ لوگ کہاں ہیں جن کو مجموعی طور پر زمانہ کہتے ہیں۔ میر انیس کی طرح ہر شخص یہی کہہ رہا ہے کہ:

عالم ہے مکدر کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

آؤ ہم سب یہ کوشش کریں کہ یہ اندازِ کلام ترک کردیں۔ انسانی زندگی جہاں بھی ہوگی اسمیں خرابیاں

ضرور ہوں گی۔ انسان کی ہر تعمیر میں کوئی نہ کوئی خرابی کی صورت مضمر ہوتی ہے۔ مگر حسب ارشاد قرآن کریم موت میں سے زندگی اور زندگی میں سے موت اُبھرتی ہے۔ جس طرح کہ دن کے بعد رات اور رات کے بعد دن آتا ہے۔ مصیبت اور رفع مصیبت نبض حیات کا زیر و بم ہے۔ ماضی کے گن گانا اور مستقبل بعید کی نسبت تصور آرائی کرنا انسان کو اپنے حال سے غافل کر دیتا ہے۔ میں نے طالب علمی کے زمانے میں لونگ فیلو کی نظم ترانۂ حیات کا اردو نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ اس کے دو چار شعر سن لیجیے۔ اگرچہ یہ بزم مشاعرہ نہیں ہے:

یادِ زمانِ رفتہ کو تو، پائے دل کی زنجیر نہ کر
اور فضائے فردا ہی میں قصرِ طلا تعمیر نہ کر
ماضی ہے مردہ اور مستقبل اب تک بطنِ عدم میں ہے
حال ہے زندہ اسیں دکھا کچھ دم باقی گر دم میں ہے
کام مشاہیرِ دنیا کے اب بھی کر سکتے ہیں ہم
یاں سے گزر جائیں تو چھوڑیں دہر پہ ایسے نقشِ قدم
نقشِ قدم رہ گم کردہ کو دستِ خضر بن جائیں جو
یاس کی شب میں بہرِ مسافر نجمِ سحر بن جائیں جو
اٹھ مرے ہمدم باندھ کمر اور صبر سے گرمِ کار ہو تو
پھر ترے سر پہ جو کچھ آئے سہنے کو تیار ہو تو

یہ انداز فکر و کلام چھوڑ دیجیے کہ حال ایسا بدحال ہے کہ ہم سے تو کچھ ہو نہیں سکتا خدا ہی اس کو درست کرے تو کرے۔ یہ مت کہیے کہ مسلمانوں کا بس خدا ہی حافظ ہے۔ ہم کو تو ان کی خوشحالی سے یاس ہی یاس ہے۔ از روئے اسلام اور از روئے بصیرتِ حیات یاس نفس کی قوتوں کو مفلوج کرنے والا کفر ہے۔ جہاں زندگی مشکلات پیدا کرتی ہے وہاں انسانی بصیرت اور ہمت اس کا حل بھی تلاش کر لیتی ہے۔ زندگی کے قفل خود اپنے اندر کنجیاں بھی بناتے رہتے ہیں:

درِ فیض است نشیں از کشائش نا اُمید ایں جا
بہ رنگِ دانہ از ہر قفل مے روید کلید ایں جا

کمزور سیرتوں کے انسان ہر مصیبت کے اسباب کو دوسروں کے سر پر تھوپتے ہیں۔ از روئے نفسیات یہ ایک حقیقت ہے کہ شدت کے ساتھ دوسروں پر الزام لگانے والا خود اپنے تحت شعور میں اسی جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔

دوسروں کے خلاف زور شور سے احتجاج کرنے کی اصل علت یہ ہوتی ہے کہ وہ خود اپنے نفس لوامہ کا مُنہ بند کرنا چاہتا ہے۔ اپنی اصلاح میں سنجیدگی کے ساتھ کوشاں ہونے والے انسان کے پاس نہ وقت ہوتا ہے اور نہ طاقت کہ اپنی محدود قوتوں کو دوسروں پر اتہام و بہتان میں صرف کرے۔

اسناد حاصل کرنے والے آج بہت خوش ہونگے کہ درسی اور تعلیمی زندگی جو چودہ پندرہ برس قبل ایام طفلی میں A. B. سے شروع کی تھی آخر B. A. تک پہنچ گئی۔ عرصۂ دراز سے آپ نے اس کو ایک منزل قرار دے رکھا تھا اور اسے کامیابی کی معراج سمجھ رکھا تھا۔ لیکن یہ امر یقینی ہے کہ یہ خوشی بہت جلد فکر سے مبدّل ہو جائے گی اور 'پس چہ باید کرد' کا جانگداز مسئلہ شعلۂ جوالہ کی طرح دل و دماغ میں خواب و بیداری میں چکّر لگاتا رہے گا۔ کالجوں سے نکلنے والے اکثر نوجوانوں کے لئے یہ دور پریشانی کا ہوتا ہے۔ ان میں اکثر یہ دیکھتے ہیں کہ زندگی میں کسی کو ہماری ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور محنتوں اور امتحانوں کی دشوار گذار وادیوں اور خار زاروں میں سے گزر کر جو علم حاصل کیا تھا اس کا کوئی خریدار نہیں۔ آپ عبید زاکانی کی طرح کہنا شروع کر دیں گے کہ

اے خواجہ مکن تا بتوانی طلب علم
تا در طلب راتب ہر روزہ نہ مانی

آپ حیران ہونگے کہ اس متاعِ کس مخر کو کوئی نہیں پوچھتا۔ آپ زیادہ تر ملازمتوں پر نظر جمائے ہوئے تھے لیکن یہ متوقع سبیلِ آب سراب ہی سراب ہے۔ کہیں ایک ملازمت ہے تو اس کے لئے سینکڑوں اُمیدوار ہیں۔ یک انار و صد بیمار والا معاملہ ہے۔ طرح طرح کے کاموں کے لئے محنت کش مزدوروں کی ضرورت ہے۔ زمین کی کاشت کے لئے کاشتکار مطلوب ہیں۔ ہر فن اور ہر ہنر والا انسان بغیر دقّت روزی کما رہا ہے۔ اگر گرانی بڑھ گئی ہے تو صناع اپنی اُجرت اُسی نسبت سے بڑھا دیتا ہے اور چونکہ معیشت کو اس کی صنعت درکار ہے اس لئے اس کی بڑھائی ہوئی اُجرت اسے ملتی جاتی ہے۔ تاجر اپنا مال مہنگا خریدتا ہے تو اسی نسبت سے مہنگا بیچتا ہے۔ آپ کا کتاب آموختہ معاشیات کا علم دو روٹیاں نہیں بنا سکتا۔ اکونومکس کا پی ایچ۔ ڈی سودا خریدنا بیچنا نہیں جانتا۔ آپ کا فلسفہ آپ کی سوسائٹی کو بیکاروں کا شغل معلوم ہوتا ہے۔ افلاطون اور ارسطو کے اشراق اور مشائیت کے مقابلے میں آپ کو موچی زیادہ خوش حال اور مطمئن نظر آتا ہے۔ جوتے کی ہر ایک کو ضرورت ہے۔ لیکن افلاطون کے تصوّراتِ سرمدی اور اعیانِ ثابتہ میں جو نصب العینی ہوتا ہے وہ خود فلسفی کے پاؤں میں نظر نہیں آتا۔ اور آپ سوچنے لگتے ہیں کہ حالی نے کیا سچ کہا ہے:

کمالِ کفش دوزی علم افلاطوں سے بہتر ہے
یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو شائی نہ اشراقی

آپ میں اکثر نوجوان ایسے ہیں جو محض بغرضِ حصولِ روزگار درس گاہوں میں داخل ہوئے تھے۔ آپ میں سے

کسی نے یہ نہ سوچا کہ ہماری تعلیم روزی پیدا کرنے کے لئے ایک نہایت بودا وسیلہ ہے۔ اس تعلیم میں بھی آپ کے جوہر پوری طرح اجاگر نہ ہو سکے۔ اس کی وجہ کچھ تو ہمارے نظام تعلیم کے نقائص ہیں جس میں سب سے بڑا خلل یہ ہے کہ ایک غیر قوم کی زبان ہماری تعلیم کے تمام نظام پر مسلط ہے۔ اس زبان کے ذریعے سے آپ جو کچھ پڑھتے ہیں اس کو اس عمدگی سے نہیں سمجھ سکتے جس طرح کہ اہل زبان سمجھتے ہیں۔ آپ کے حافظے میں بھی اس نیم فہمیدہ معلومات کے نقوش اس طرح ثبت نہیں ہوتے کہ دیرپا اور خیال انگیز ہو سکیں۔ اس کے بعد بیان کرتے ہوئے آپ کا خام علم تولنے کا ماشہ رہ جاتا ہے۔ آپ نے حافظہ پر زور دے کر جو کچھ الفاظ اور معلومات جمع کئے تھے انہیں آپ امتحانوں کی جوابی بیاضوں میں انڈیل دیتے ہیں اور چند ہی روز میں دل و دماغ پھر خالی کے خالی رہ جاتے ہیں یا پریشانیوں سے بھر جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ناکامیوں کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ میں سے اکثر نوجوان ایسے ہیں جو کالجوں کی بجائے زندگی کے اور میدانوں میں بہتر جولانی دکھا سکتے تھے اگر ہمارا نظام معیشت و معاشرت آپ کی کماحقہٗ رہنمائی کرتا۔ زندگی کی نسبت مایوسانہ زاویۂ نگاہ کو غلط اندیش اور کفر آمیز قرار دینے کے باوجود اس تلخ حقیقت سے چشم پوشی کرنا دشوار ہے کہ ہمارے تمدن میں سب سے زیادہ مظلوم طبقہ وہ ہے جس سے ہمارے کالج اور ہماری یونیورسٹیاں بھری پڑی ہیں۔ اس دریائے مظلومی میں بہت سے تو ڈوب جاتے ہیں:

دریں ورطۂ کشتی فروشد ہزار
کہ پیدا نہ شد تختہ اش بر کنار

کچھ نوجوان غوطے کھاتے ہوئے ہاتھ پاؤں مار کر کسی کنارے تک پہنچ جاتے ہیں لیکن کسی قدر افاقے کے بعد محسوس کرتے ہیں کہ ساحل پر بھی منجدھار کے مقابلے میں زیادہ آسودگی نہیں۔ کنارے پر پہنچنے کے بعد بھی سفر حیات کے لئے کوئی معین راستے دکھائی نہیں دیتے۔ رہبری کے دعویوں کی کوئی کمی نہیں۔ راہرو بھی مختلف راہوں پر گامزن ہیں۔ ہر ایک مختلف سمتوں کی طرف اشارہ کرتا ہے اور وثوق کے ساتھ کہتا ہے کہ سیدھا راستہ یہی ہے۔ آپ کی کیفیت وہی ہوتی ہے جو غالب نے اس شعر میں بیان کی ہے کہ:

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

اس پریشانی کا نقشہ میں نے آپ کے سامنے اس لئے نہیں کھینچا کہ آپ کی قوتیں یاس سے مفلوج ہو جائیں۔ انسانی زندگی میں پنپنے کی لامحدود قوتیں ہیں۔ انسانی نفس کے ممکنات کی کوئی انتہا نہیں۔ مصائب کا اثر دو مختلف سیرتوں پر مختلف ہوتا ہے۔ کمزور سیرت والا انسان مصائب اور موانع کو دیکھ کر مایوس و مفلوج ہو جاتا ہے لیکن قوی سیرت کیلئے ہر رکاوٹ ایک چیلنج ہوتا ہے جو ارادے کو مضبوط اور ہمت کو بلند کرتا ہے۔ مشرقی پنجاب کے ایک صوفی نے جن کا نام بھیک تھا اور جن کے عقیدت مند لڑکوں کا نام غلام بھیک رکھتے ہیں اس حقیقت کو بڑے مؤثر انداز میں پیش کیا ہے:

بھیکا بھوکا کوئی نہیں سب کی گدڑی لال
گرہ کھول نہیں جانتا اس لئے ہے کنگال

نامساعد حالات کو دیکھ کر آپ سپر انداختہ نہ ہوں۔ زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز۔

جس قسم کی سیاسی جدوجہد پاکستان کی آزاد مملکت کو معرضِ شہود میں لائی وہ جہاد اصغر تھا۔ اس نے کامیابی کے اثمار آپ کی جھولی میں نہیں ڈال دئے بلکہ زندگی کے جہاد اکبر کے لئے مواقع مہیا کئے ہیں۔ اس سیاسی آزادی نے آپ کے لئے کوئی سلسبیل جاری نہیں کر دی۔ آپ کو اپنی پیاس بجھانے کے لئے خود کنوئیں کھود کر پانی پینا ہے۔ ملک وملت کی جو حالت ہے وہ افراد کی پیدا کردہ اور حالات کی آوردہ ہے۔ اگر حالات پریشان کن ہیں تو ان کی نوحہ سرائی نہ کیجئے۔ حالات کی مرثیہ خوانی باہمت قوموں کا شیوہ نہیں۔ اس نوزائیدہ ملت کو زندگی کے ہر شعبے میں انقلابی کوششوں کی ضرورت ہے لیکن آرزوئے انقلاب یہ نہیں کہ آپ اس کے منتظر رہیں کہ کوئی عسکری آمر کچھ افسروں اور عہدہ داروں کو کسی خفیہ سازش سے ہم نوا کر کے ملک وملت کے سیاہ وسفید کا مالک ہو جائے۔ ایسے انقلابات جنوبی امریکہ میں ہر روز ہوتے رہتے ہیں جس سے وہاں کی سیاسی اور معاشی زندگی میں ایک مسلسل طوفان بپا رہتا ہے۔ بے بصر آمروں میں جوش زیادہ ہوتا ہے اور ہوش کم۔ اور ان کی مطلق العنانی اکثر خام جمہوریت سے بھی بدتر ہوتی ہے۔ انقلاب کا ماخذ انسانی نفوس ہیں نہ کہ توپ و تفنگ۔ اگر قوم کے نفوس میں انقلاب نہ ہو تو بساطِ سیاست کے مہروں کا مختلف خانوں میں جست لگاتے رہنا کوئی اصلاحی تبدیلی پیدا نہیں کر سکتا۔ ایسے سیاست کیش لوگ خود غرضی کی بوتلیں ہیں جن کے اندر جو کچھ بھرا ہے وہ تو جوں کا توں رہتا ہے مگر گردشِ اغراض سے باہر کے لیبل بدلتے رہتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اقوام کے انقلاب کی نسبت جو کلیہ بیان کیا ہے اس کو حرزِ جان بنائیے کہ جب تک کسی قوم کے نفوس کی حالت میں انقلاب نہ ہو تب تک اس کی حالت نہیں بدلتی۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتیٰ یغیروا ما بانفسھم

حال ہی میں جون اسٹوارٹ مل کا ایک بیان میری نظر سے گزرا جو بعینہٖ اس آیت کا لفظی ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ کبھی یہ خیال دل میں نہ لائیے کہ کیا میں اور کیا میری بساط۔ کیا پدی اور کیا پدی کا شوربا۔ ایک چنا کیا بھاڑ پھوڑ سکتا ہے۔ یہ ایک بزدلانہ وسوسہ ہے۔ قوم آخر افراد ہی کے مجموعے کا نام ہے۔ ایک صاحبِ ہمت وبصیرت شخص جب خود اپنے نفس میں انقلاب پیدا کرتا ہے تو کثرت سے دوسرے نفوس اس سے متاثر ہوتے ہیں۔ انسانوں کے نفوس میں ایک دوسرے سے اثر پذیری کا شدید مادہ موجود ہے۔ کسی نفس کی نیکی اور بدی دونوں متعدی ہوتی ہیں۔ اگر آپ اپنے سیاست کیشوں سے بیزار ہیں تو میدانِ سیاست میں قدم رکھتے ہوئے آپ دیانت اور خودداری کی مثال قائم کرنے کی کوشش کیجئے۔ اگر آپ مدعیانِ دین کی تنگ نظری اور جمود سے آزردہ ہیں تو ان کو نشانہ

ملامت بنانے کی بجائے خود اپنے اندر وسعتِ نظر اور وسعتِ مشرب پیدا کیجئے اور دور از کار عقائد و فروع کی پیکار سے گریز و پرہیز کرتے ہوئے فقط رفاہ و فلاح خلق کو اپنے دین کا اہم اور مؤثر جزو بنائیے۔ جیسا کہ رسولِ کریمؐ نے فرمایا "ایمان کا جزو کثیر اعمال صالحہ ہیں"۔ محض تقریروں اور تحریروں اور مناظروں سے دوسروں کو ہم عقیدہ بنانے کی سعی لاحاصل کو ترک کر کے ایسی زندگی اختیار کیجئے کہ وہ دوسروں کے لئے خود ایک بولتی ہوئی مثال بن جائے۔ علم جاننے سے آتا ہے اور فن کرنے سے لیکن اخلاق اچھی مثال اور اچھی صحبت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں تہذیبِ اخلاق اور تعمیرِ سیرت کے اور تمام طریقے غیر مؤثر ہیں۔ اچھی مثالیں کتابوں میں بھی مندرج ہیں اور ان کا اثر بھی محض وعظ و پند سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن انسان کے گرد و پیش زندہ مثال بدرجہا زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔ کسی گری ہوئی قوم میں بھی اچھی مثالیں ناپید نہیں ہوتیں۔ البتہ شاذ ضرور ہوتی ہیں۔ ایسی مثالوں کو سامنے رکھ کر اپنی سیرت کو ڈھالئے۔ زندہ مثال کے مؤثر ہونے کی نسبت میں آپ کو حضرت نقشبند علیہ الرحمۃ کا ایک قطعہ سناتا ہوں اور اسی پر ختم کرتا ہوں تاکہ آپ مجھ پر واعظوں کی طول بیانی کا الزام نہ لگائیں:

تا کے بزیارتِ مقابر — عمرے گذرانی اے فسردہ
یک گربۂ زندہ پیشِ عارف — بہتر ز ہزار شیرِ مُردہ

پاکستان بناتے ہوئے آپ نے خدائے تعالےٰ سے کچھ وعدے کئے تھے کہ اگر ہمیں ایک آزاد مملکت مرحمت ہو جائے تو ہم اس کی معیشت و معاشرت و سیاست کو پاکیزہ اور عادلانہ اسلامی اخلاق میں ڈھالیں گے۔ آپ مسلمان ہیں اور مسلمان کی اہم صفت یہ بیان کی گئی ہے کہ "المسلم اذا وعد وفا" مسلمان جب وعدہ کرتا ہے تو اس کو پورا کرتا ہے۔ آپ دوسروں کو چھوڑئیے۔ فقط اپنے نفس کا محاسبہ کرتے رہئے کہ میں اس وعدے کو جو خدائے حاضر و ناظر سے کیا تھا پورا کر رہا ہوں یا نہیں۔ صالحین کے لئے خدائے تعالےٰ کا بھی ازلی وعدہ موجود ہے کہ پاکیزہ سیرت والوں کو دنیا و آخرت کے حسنات عطا کرے گا۔ آپ اپنا وعدہ پورا کیجئے اور اس کا تجربہ کر لیجئے کہ خدائے تعالےٰ وعدہ خلافی نہیں کرتا:

"اِنَّ اللہ لا یخلف المیعاد"

مصنفہ شاہد حسین رزاقی

تاریخِ جمہوریت

جمہوری افکار و ادارات کے ارتقاء کی مکمل تاریخ

قیمت آٹھ روپے

ادارۂ ثقافت اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور